# تنقید و تبصرہ

## سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء

مصنف جناب سید محمد الحسنی

ناشر مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (ہندوستان)

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال (۱۷۰۷ء) پر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ یہ دور اُن کی کامل سیاسی بالاتری کا تھا اس کے بعد ان کے سیاسی زوال کا آغاز ہوتا ہے، جو بڑی سُرعت سے پھیلتا چلا گیا۔ لیکن اس سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں ایسی دینی، فکری، علمی اور اصلاحی و اجتماعی تحریکیں بھی جنم لیتی ہیں، جن کے پیش نظر مسلمانوں کے بادشاہوں اور حکمران طبقوں سے ہٹ کر ان کے عوام کو بیدار کرنا اور انہیں نئی زندگی بخشنا تھا۔ ان تحریکوں کا سلسلہ شاہ ولی اللہ صاحب سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۵۷ء کی کامل شکست کے بعد پہلے یہ مدرسۂ دیوبند، علی گڑھ کالج، ندوۃ العلماء حمایت اسلام لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور وغیرہ کی شکل میں تعلیمی قالب اختیار کرتی ہیں اور آگے چل کر انہیں کے زیر اثر مسلمانان پاک و ہند کی سیاسی جدوجہد کی طرح پڑتی ہے اور ہم سیاسی لحاظ سے اس مقام پر پہنچتے ہیں، جہاں اس وقت ہیں۔

۱۷۰۷ء سے بعد کا یہ دور، جسے اگر ہم ایک لحاظ سے تعمیری دور کا نام دیں، تو چنداں بے محل نہیں ہوگا بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب یہ دور ہمارے ارباب علم اور اہل تحقیق کا موضوع بحث بن رہا ہے اور اس دور کی جملہ تحریکوں پر مفصل اور جامع کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ سرسید اور مولانا محمد قاسم کے سوانح حیات پر کافی لکھا جا چکا ہے، جناب سید محمد الحسنی نے بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری کی سیرت مرتب فرما کر اس دور کی ایک اہم تحریک اور اس کے نامور داعی و بانی سے موجودہ نسلوں کو متعارف کرایا ہے۔ زیر نظر کتاب بڑی تحقیق، دلی شغف اور خلوص و محنت سے لکھی گئی ہے، اور اس کی طباعت بھی بڑے اہتمام سے ہوئی ہے۔

مولانا سید محمد علی صاحب ۲۸ جولائی ۱۸۴۶ء کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ وہیں کے ایک مدرسۂ فیض عام میں تعلیم پائی اور آپ نے اس زمانے کے متداول علوم پڑھے۔ اس کے ساتھ ہی اسی عمر میں تصوف

سے بھی لگاؤ رہا۔ بعد میں اس زمانے کے مشہور بزرگ مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی سلسلۂ ولی اللہی کے نامور بزرگ" حاجی امداد اللہ صاحب نے بھی مولانا کو چاروں سلسلوں کی اجازت عطا کی تھی۔ ایک تسبیح، ایک چادر اور ایک چادر بطور خرقہ کے بھیجی تھی"۔

ایک طرف مولانا نے ان تمام علوم کی تحصیل کی، جو ایک مستند عالم کے لئے اس زمانے میں ضروری تھے، دوسری طرف آپ نے تصوف و معرفت کی بھی راہ طے کی غرض اس طرح وہ ایک عالم دین کے ساتھ ساتھ ایک صاحب معرفت صوفی بھی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اس دور میں اور اپنی تعلیمی زندگی کی ابتدا ہی میں مولانا کا اجتماعی شعور کتنا بیدار تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آپ نے اس زمانے میں "انجمن تہذیب" کے نام سے کانپور میں ایک انجمن بنائی، جس کا "مقصد علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں صحیح اسلامی افکار کی اشاعت و ترجمانی اور ان کے درمیان باہمی اتحاد اور اخوت پیدا کرنا تھا"۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ بڑے جارحانہ انداز سے کی جارہی تھی دوسرے حساس اور بیدار مغز مسلمان علماء کی طرح مولانا مونگیری پر بھی اس کا شدید ردعمل ہوا۔ چنانچہ اس کے جواب میں انہوں نے ردّ عیسائیت کے سلسلے میں جدوجہد کی، وہاں ان میں مسلمان علماء کو آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے فکری و تنظیمی لحاظ سے تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس نے بعد میں ندوۃ العلماء کی تحریک کی شکل اختیار کی۔ مصنف نے "تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا پس منظر" بڑی خوبی اور نہایت وضاحت سے اس ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس میں ندوۃ العلماء کی تحریک کی داغ بیل پڑی۔ یہ کتاب کا سب سے زیادہ سبق آموز اور بصیرت افروز حصہ ہے۔ اس وقت عربی و دینی تعلیم کا پرانا نصاب کتنا جامد اور فرسودہ تھا، مصنف نے بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔ "اس نصاب درس اور طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ان کے سامنے کوئی ایسا تعمیری اور انقلابی میدان نہ رہا جہاں ان صلاحیتوں اور طاقتوں کا مظاہرہ ہوتا.... نتیجہ یہ ہوا ان کی یہ صلاحیت ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق، فروعی اختلافات، جماعتی عصبیت اور علمی طبقہ واریت کی نذر ہو کر رہ گئی .... ہندوستان کے مقتدر علماء اور نامور شخصیات پر کفر کے فتوے لگائے گئے.... پوری امت مقلدین اور غیر مقلدین میں تقسیم ہو گئی۔ اہل حدیث اور اہل فقہ کے دو الگ الگ گروہ بن گئے۔ اور ایک دوسرے سے اس طرح برسر پیکار ہوئے کہ گویا وہ دو مختلف مذاہب

کے پیرو ہیں۔ ساری طاقت آمین بالجہر، قرأۃ فاتحہ اور رفع یدین کے نقض یا اثبات پر صرف کر دی گئی۔ فقہ کے جزئیات اور مختلف فیہ مسائل پر جن پر اسلام کی بقا و ترقی کا انحصار نہ تھا ضخیم مناظرانہ کتابیں تیار ہونے لگیں۔ مناظرے ہوئے، اور طنز و تعریض کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ معاملات صرف مناظروں تک محدود نہ رہتے، بلکہ تقلید اور عدم تقلید پر مقدمہ بازیاں عدالتوں تک پہنچیں جن میں فیصلہ کرنے والے غیر مسلم ہوتے تھے۔ بقول مصنف کے "...... یہی قوم دیکھتے دیکھتے بأسهم بينهم شديد کی زندہ تصویر بن گئی اور مختلف صفات اور صلاحیتوں کے افراد جو ایک لڑی میں پیوستہ تھے، باہم دست و گریباں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے" اس کے علاوہ امت میں دو گروہ اور بھی تھے جو اس وقت ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے اور وہ تھے جدید اور قدیم گروہ۔ ایک ہر نئی چیز کو خیر و صواب سمجھتا تھا۔ اور دوسرے کے نزدیک قدامت بمنزلہ تقدس کے تھی۔

یہ تھا اسلامی ہندوستان کا وہ ماحول، جس میں مولانا سید محمد علی صاحب نے ندوۃ العلماء کی تحریک کی آواز بلند کی۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی پر علماء کی ایک مجلس شاورت نے علماء کی ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا، دوسرے سال کے جلسے میں ہندوستان کے ممتاز علماء شریک ہوئے، اور اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء رکھا گیا۔ اور اس کے ناظم مولانا سید محمد علی مقرر ہوئے۔

ندوۃ العلماء کی تنظیم میں ایک تو ہر مکتب خیال کے علماء منسلک تھے، دوسرے اس کے سالانہ جلسوں میں جہاں علماء شریک ہوتے، وہاں جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی مدعو کئے جاتے، اور علماء کے ساتھ ساتھ وہ بھی حاضرین کو خطاب کرتے۔ مختلف مکاتیب کے علماء اور پھر علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اس طرح کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کرنا اس زمانے میں ایک بہت بڑا انقلابی اقدام تھا اور یہ محض تحریک ندوۃ العلماء کی بدولت ممکن ہو سکا اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کے پیش نظر عربی دینی تعلیم کے نصاب اور طریقے کی اصلاح بھی تھی چنانچہ اس سلسلے میں یہ کوششیں بھی بروئے کار لائی گئیں۔

ندوۃ العلماء کا مقصد کیا تھا؟ بالکل ابتدا ہی میں مولانا سید محمد علی صاحب نے اپنی ایک تحریر میں

اس کی وضاحت فرمائی تھی۔ آپ نے عربی و دینی تعلیم کی فرسودگی اور اس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی بدحالی اور کس مپرسی کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں خود علماء میں جو نزاع باہمی اور جماعتی عصبیت پائی جاتی تھی، اسے بڑی دلسوزی سے یوں بیان فرمایا تھا۔

"اب خیال کیجئے مقلدین و غیر مقلدین میں کیسی کیسی شرمناک لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی جان کا، مال کا، آبرو کا کس طرح خواہاں ہوتا ہے۔ خلاف مذہب کے اجلاس میں مقدمات جاتے ہیں۔ ہمارے محترم علماء مجرموں کی طرح سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث ان کے جوتوں کے پاس ان کے نیچے ڈھیر ہوتی ہیں۔ اور آمین اور رفع یدین کی تحقیق جناب چوبے گھنشیام داس صاحب بہادر اور کرمول صاحب بہادر کے روبرو پیش ہوتی ہیں۔ اور اس کو دین خیال کیا جاتا ہے"[1]

اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کانپور کی دستاربندی کے موقع پر ندوۃ العلماء کا پہلا جلسہ ہوا، اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں سال بہ سال یہ جلسے ہوتے رہے، اور اس طرح بعض حلقوں کی مخالفت کے باوجود ندوۃ العلماء کا پیغام برصغیر کے ہر حصے میں پہنچا، آخر ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ابتدائی درجہ قائم کر دیا گیا، جس نے آگے چل کر موجودہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شکل اختیار کیا۔

جب تک ندوۃ العلماء کی حیثیت ایک تحریک اور نظریے کی رہی، اس کے بانیوں اور شرکاء میں کوئی زیادہ اختلاف نہ ہوا، لیکن جیسے ہی اس تحریک نے ایک ٹھوس تعلیمی ادارے کو جنم دیا، علمائے کرام میں اختلافات شروع ہوگئے۔ سب سے بڑا اختلاف تو نصاب تعلیم پر ہوا، اور یہ قدرتی تھا کیونکہ جہاں تک قدیم نظام درس اور جدید طریقۂ تعلیم کا تعلق ہے ان دونوں کی راہیں اس وقت بھی بالکل واضح تھیں، اور آج بھی اسی طرح واضح ہیں، لیکن ان دونوں کے بیچ میں اعتدال کی راہ کیا ہے؟ اور قدیم و جدید طریقہائے تعلیم کو کس طرح باہم سمویا جائے؟ اس کا فیصلہ نہ اس وقت ہوا، اور نہ بدقسمتی سے آج ہو پا رہا ہے۔ اگر قدیم کو ترجیح دی جاتی ہے تو جدید طبقے بدک اٹھتے ہیں اور اگر جدید کو زیادہ اہم

---

[1] روئداد سال اول حصہ اول (ص ۱۲-۱۶) باختصار

سمجھا جاتا ہے، تو قدیم خیال والے بدظن ہو جاتے ہیں یہی وجہ اُس وقت اِس اختلاف کی ہوئی۔ اور اسی بنا پر دیوبند اور علی گڑھ، یعنی قدیم اور جدید تعلیمی تحریکوں کے بعد ندوۃ العلماء اور بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت عام نہ ہو سکی۔ اور یہ دونوں تعلیمی ادارے اور ان کی راہِ وسط بس ان کی حدود تک سمٹ کر رہ گئی۔

مولانا شبلی جو بعد میں تحریک ندوۃ العلماء میں شریک ہوئے تھے، یہ اختلاف دراصل ان میں اور مولانا سید محمد علی اور ان کے رفقائے کار میں تھا۔ اس اختلاف کی اجمالی تصویر خود مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

> مولانا (شبلی) کو ارباب ندوہ سے جو بنیادی اختلاف تھا، اس میں اور وجوہ کے ساتھ نصاب تعلیم اور انگریزی کا مسئلہ خاص طور پر شامل تھا۔ مولانا (شبلی) چاہتے تھے کہ قدیم نصاب میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے، وہ سب کی سب قبول کر لی جائیں۔ قدیم تعلیمی ڈھانچہ یک قلم منسوخ کر دیا جائے، اور انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے۔ لیکن مولانا محمد علی اس عجلت کو نہ مفید سمجھتے تھے، نہ ممکن۔ وہ تدریجی طور پر اور نرم روی کے ساتھ تبدیلیوں کے حامی تھے۔ ان کے ساتھ اور دوسرے مدرسین اور عہدہ داران بھی اس عجلت اور انتہا پسندی کے حق میں نہ تھے۔"

اس اختلاف کی بعض تفصیلات دینے کے بعد مصنف لکھتے ہیں:۔

> "پالیسی کا یہ اختلاف انداز فکر اور ذہن و مزاج کے اختلاف سے مل کر رفتہ رفتہ شدت اختیار کرتا گیا۔ اور یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی گئی۔"

اور آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ ندوۃ العلماء کی تحریک ایک عام تحریک نہ بن سکی، اور اس کا قائم کردہ دار العلوم ایک محدود سا تعلیمی ادارہ بن کر رہ گیا۔[۱] ۱۹۰۳ء میں مولانا سید محمد علی صاحب اس کی نظامت سے علیحدہ

---

[۱] مولانا سید ابو الحسن علی صاحب زیر نظر کتاب کے مقدمے میں فرماتے ہیں:۔

"(یہ کتاب) نہ صرف ایک عظیم و برگزیدہ شخصیت کی سوانح ہے، بلکہ ایک عظیم تحریک کی تاریخ بھی ہے ایک معاشرے کی تصویر بھی ہے۔ اور ایک پورے دور کی عکاسی بھی۔ ماضی کی سرگزشت بھی ہے اور مستقبل کا وہ خواب بھی، جو خدا کے ایک برگزیدہ و عالی ہمت بندہ نے دیکھا تھا اور جس کی تعبیر پورے طور پر ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔۔۔۔"

ہوکر مونگیر (بہار) تشریف لے گئے، اور وہاں ان کی سرگرمیاں تمام تر "قادیانیت کے مقابلے" اور سلوک و ارشاد اور اصلاح عام تک مرتکز ہوگئیں یہاں تک کہ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کو یہ آفتاب رشد و ہدایت غائب ہوگیا

مولانا سید محمد علی صاحب واقعی ایک جامع شخصیت تھے علم دین، تصوف و معرفت، قدیم یہ عہد، جدید رجحانات کا احساس، اجتماعی شعور، دوسروں سے مل جل کر کام کرنا، رواداری اور وسعت قلبی، یہ سب خوبیاں آپ کی ذات میں جمع تھیں، انہوں نے تحریک ندوۃ العلماء کو انہی خطوط پر چلانے کی کوشش کی لیکن جس زمانے اور جس فضا میں یہ تحریک چلی، وہ ان مقاصد کے لئے زیادہ سازگار نہ تھی چنانچہ مرحوم نے جو خواب دیکھا تھا اس کی پوری طرح تعبیر نہ ہوسکی۔

اور یہ صرف اسلامی ہند میں ہی نہیں ہوا، اسی زمانے کے لگ بھگ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی قدیم و جدید کو سمو کر ایک راہ وسط نکالنے کی جو کوشش ہوئیں، وہ بارآور نہ ہوسکیں مثال کے طور پر ترکی میں "تنظیمات" کی تحریک ناکام ہوئی۔ اور اس کی جگہ "اتحاد و ترقی" اور "کمالیت" نے لے لی۔ اسی طرح مصر میں شیخ محمد عبدہ، اور دارالعلوم کی قدیم و جدید کو ہم رشتہ کرنے کی تحریک موثر ثابت نہ ہوئی، اور اب وہاں "ناصریت" کا غلبہ ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ مولانا سید محمد علی صاحب اور ان جیسے ذہن و قلب رکھنے والے بزرگوں نے ایک زمانے میں اسلامی معاشرے کے مستقبل کے بارے میں جو خواب دیکھے تھے، اور جن کی اس وقت تعبیر نہیں ہوسکی کیا اب یا آئندہ ان کی تعبیر کا کوئی امکان ہے، ہمارے خیال میں اگر ان تعبیر کرنے والوں کے سامنے اسلام کا بھی یہی تصور ہے جو زیر نظر کتاب کے صفحہ ۷۷ پر درج ہے، تو ان خوابوں کی تعبیر ہونا بڑا ہی مشکل نظر آتا ہے۔

"اسلام کا مقصد اور قرآن کا موضوع انسان کی ہدایت ہے، نہ کہ اس کی مادی ترقی"

آج اس زمانے میں "انسان کی ہدایت" کو "اس کی مادی ترقی" سے بے تعلق بنانے کو سوائے اس کے حقائق سے آنکھیں بند کرنا اور فراریت کہا جائے، اور کیا کہا جا سکتا ہے، اور بدقسمتی سے آج "راہ وسط" کی اکثر تحریکوں کا دارالعلوم ندوۃ العلماء سمیت یہی حشر ہو رہا ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے "تذکیر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ" ہونے کا تعلق ہے، مصنف کی یہ کوشش بڑی کامیاب ہے، اور ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ انہوں نے سیرت نگاری کے ساتھ ساتھ اکثر جگہ تجزیے اور تنقید سے بھی کام لیا ہے، جس نے اس کتاب کی افادیت کو بہت بڑھا دیا ہے